Vol. 6 No.2 2022

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

سر سید احمد خاں اور علامہ محمد اقبال کی رسول اللہ ﷺ سے عقیدت

Gulzar Ahmad
Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore./ Lecturer, Department of Urdu, Beaconhouse, Liberty campus, Lahore.

Abstract:

Sir Syed Ahmad Khan occupies a prominent position as the flag bearer of renaissance for Muslims after the War of Independence of 1857. His ancestors belonged to the Mughal courts. In this environment, Sir Syed Ahmad Khan was born in Delhi in 1817 and read the early books of religious education. He was fond of writing and editing. His book on Antiquities of Delhi "Atar al-Sanadid" was loved in every circle. Sir Syed was appointed Sub Judge in Bijnor in 1855 (Sadar Amin). He also edited and published a book called Aain Akbari during his stay in Bijnor. Sir Syed Ahmad Khan lived in Moradabad, Ghazipuri and Aligarh. Established "Scientific Society" in Aligarh 1863. Here he translated some English books on history and political science. Issued "Institute Gazette" here. Sir Syed Ahmad Khan was its editor throughout his life. He went to England to write the response to Sir William Peacock's book. England to write a response to Sir William Peacock's book. There he got the title of C.S.I. The name of the book prepared in response to William Peacock's book "Serat Rasool" is "Khatbat Ahmadiyya". After returning from England in 1870, he published the magazine "Tahzeeb-ul-Akhlaq". In 1875 Madrasatul Uloom was established in Aligarh, in 1878 it reached the level of a college and in 1920 it got the status of a university. A few years after he established the "Educational Conference". After the War of Independence, he wrote a short book, ‘‘the causes of Indian revolt’’ and inspired Muslims to get modern education.

The religious thought of Sir Syed Ahmad Khan was disagreed the Majority of Muslim scholars. Allama Iqbal has given very little reference to the thought of Sir Syed Ahmad Khan. A poem in "Bangdara" is named after him. Allama Iqbal realized that he could not express his thoughts about Syed Ahmad Shaheed Barelvi (Balakot) and Sir Syed Ahmad Khan. In Javed Nama, Iqbal presented some thoughts on behalf of many Muslim and non-Muslim scholars. Allama Iqbal did not mention Sir Syed Ahmad Khan in his sermons. Iqbal did not generally praise or criticize Sir Syed Ahmad Khan. Iqbal considered Sir Syed Ahmad Khan only as an educational reformer. Sir Syed Ahmad Khan was not a philosopher.

Keywords: Allama Iqbal; Independence; Sir Syed; Mughal courts; Scientific Society; Institute

سر سید احمد خاں 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے لیے نشاۃ ثانیہ کے علم بردار کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤاجداد مغل درباروں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی ماحول میں سر سید احمد خاں سن 1817ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور دینی تعلیم کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ انھیں تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ "آثار الصنادید" دہلی کے آثار پر ان کی کتاب ہر حلقے میں پسند کی گئی۔ سر سید سن 1855ء میں بجنور میں سب جج مقرر ہوئے (صدر امین)۔ آئین اکبری نامی کتاب بھی ایڈٹ کرکے بجنور میں قیام کے دوران شایع کی۔ سر سید احمد خاں مراد آباد، غازی پوری اور علی گڑھ میں مقیم رہے۔ سن 1863ء میں علی گڑھ میں "سائنٹیفک سوسائٹی" قائم کی۔ یہیں انھوں نے تاریخ و سیاسیات پر بعض انگریزی کتابوں کے تراجم کرائے۔ یہیں "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری کیا۔ سر سید احمد خاں عمر بھر اس کے ایڈیٹر رہے۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے انگلستان گے۔ وہاں انھیں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ ولیم میور کی کتاب "سیرت رسولؐ" کے جواب میں جو کتاب تیار کی اس کا نام "خطبات احمدیہ" ہے۔ سن 1870ء میں انگلستان سے واپس آکر رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ سن 1875ء میں "مدرسۃ العلوم" علی گڑھ میں قائم کیا، سن 1878ء میں کالج کے درجے تک پہنچا اور سن 1920ء میں اسے یونی ورسٹی کا درجہ مل گیا۔ کالج کے قیام کے چند برس بعد "ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی۔ جنگ آزادی کے بعد ایک مختصر کتاب "رسالہ اسباب بغاوت ہند" تحریر کی تھی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

سرسید احمد خاں کی دینی فکر سے جمہور علما کو اختلاف تھا۔ علامہ اقبال نے سرسید احمد خاں کی فکر کا حوالہ بہت کم دیا ہے۔ "بانگ درا" میں ایک نظم ان کے نام ہے۔ علامہ اقبال کو اس بات کا احساس تھا کہ سید احمد شہید بریلوی (بالاکوٹ) اور سرسید احمد خاں کے متعلق وہ اپنے افکار پیش نہیں کر سکے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے متعدد مسلم و غیر مسلم اسکالرز کی زبان سے کچھ افکار پیش کیے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں سرسید احمد خاں کا ذکر نہیں کیا۔ اقبال نے مجموعی طور پر سرسید احمد خاں کی تحسین و تنقید نہیں کی۔ اقبال سرسید احمد خاں کو صرف تعلیمی مصلح سمجھتے تھے۔ سرسید احمد خاں کوئی فلاسفر نہ تھے۔

"ارمغان حجاز" میں بھی اقبال نے سرسید احمد خاں کا ذکر کیا ہے۔ بھوپال میں ایک خواب میں سرسید احمد خاں کی زیارت کا حال سرراس مسعود کو ایک خط میں لکھا ہے۔ سرسید احمد خاں نے اقبال سے خواب میں کہا تھا کہ اپنی بیماری کا حال حضور اکرم ﷺ کے حضور پیش کرو۔ نواب بھوپال کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ (اقبال) قرآن پر اپنے افکار پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ سرراس مسعود کے جد امجد حضور اکرمؐ کے سامنے کوئی خدمت پیش کر سکوں۔

مشہور مصلح اور علی گڑھ کالج کے بانی تھے۔ دہلی کے معزز سید خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے والد سید محمد متقی خاں درویش مزاج انسان تھے۔ نانا خواجہ فرید دبیر الملک مغل بادشاہ اور انگریزی کمپنی کے درمیان سفارت پر مامور تھے۔ ابو ظفر بہادر شاہ نے سرسید کو جواد الدولہ "عارف جنگ" کا خطاب دیا تھا۔ سرسید کی تعلیم و تربیت ننھیال میں ہوئی۔ فارسی درسیات، عربی، قدیم ہیئات، ریاضی اور طب پڑھی۔ انگریزی کمپنی میں سن 1846ء۔1854ء میں پہلے سرشتہ دار اور پھر منصف مقرر ہوئے۔ ان کی کتاب "آثار الصنادید" دہلی کی عمارتوں کے متعلق پہلے 1847ء میں اور پھر تصحیح و ترمیم کے ساتھ 1854ء میں شایع ہوئی۔ انگریزی حکام نے بھی اس کتاب کو پسند کیا۔ پروفیسر دتاسی نے اس کتاب کا 1861ء میں فرانسیسی ترجمہ شایع کیا۔ سن 1855ء میں صدر امین (سب جج) بجنور مقرر ہوئے اور وہاں "آئین اکبری" تصحیح و تحشیہ کے بعد شایع کی، مگر آخری جلد 1857ء کے ہنگامہ میں ضایع ہو گئی۔ یہی حال "تاریخ ضلع بجنور"" کا ہوا۔ سرسید کو ملازمت کی خدمات کے عوض خاص وظیفہ اور عہدہ صدر الصدور ملا۔ مرادآباد، غازی پور اور علی گڑھ میں مقیم رہے۔ علی گڑھ میں 1863ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی، جہاں علوم جدید پر تقریریں کرائیں اور انگریزی سے تاریخ و سیاسیات کی بعض کتابیں بھی ترجمہ کرائیں، اسی جگہ سے اردو اور انگریزی اخبار جاری کیا جو بعد میں "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ سرسید نے ساری زندگی اس کی ادارت کی۔ [1]

سن 1869ء میں انگلستان جا کر انگریزی عمائد و حکام سے ملاقاتیں کیں اور سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب پایا۔ ولیم میور کی سیرت رسول ﷺ کے جواب میں محققانہ مقالات لکھ کر انگریزی میں شایع کیے جن کی بعد میں "خطبات احمدیہ" کے نام سے اشاعت ہوئی۔ میور کی غلط بیانیوں کی پردہ دری کی۔ حب رسول ﷺ کی وجہ سے اس کتاب پر بڑی محنت کی اور دہلی کے اثاث البیت فروخت کر کے خرچ برداشت کیا۔ سن 1870ء میں وطن واپس آکر قوم کی اصلاح اور علوم جدیدہ کی اسلامی درس گاہ بنانے کی تیاریاں کیں۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ سن 1875ء میں نئے "مدرسۃ العلوم" کا افتتاح کیا۔ سن 1876ء میں پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے۔ سن 1878ء میں کالج کے درجے کی تعلیم کا آغاز کیا۔ بیس سال کی مسلسل محنت سے شاندار عمارتیں، اقامت خانے، مسجد، باغات، یورپی اساتذہ اور جو لوگ کالج سے وابستہ تھے ان کے بنگلے تعمیر ہو گے۔ سیکڑوں طلبہ جمع ہو گے لیکن سرسید کی یونی ورسٹی بنانے کی آرزو تاحیات تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ [2]

کالج کے قیام کے چند سال بعد "ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی، جس کے ہر سال بڑے بڑے شہروں میں جلسے منعقد کر کے مسلمانوں میں تعلیم کی تبلیغ کرتے رہے۔ عقاید کی اصلاح کے لیے نئے علم کلام کی تحریک اور قرآن مجید کی تفسیر کا آغاز کیا۔ سرسید کی وفات تک اس کی پانچ جلدوں کی اشاعت ہوئی۔ جو نصف قرآن کا احاطہ کرتی تھیں۔ اگرچہ ان کے اکثر اجتہادات مذہبی علما میں مقبول نہ ہوئے۔ سیاسی معاملات میں سرسید مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ [3]

1857ء کی تحریک میں مسلمانوں کی تباہی سے محتاط ہو گے۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں کا مسلمانوں، اردو زبان اور ہندستان کی متحدہ تہذیب کی دوسری روایات سے تعصب دیکھا تو وہ سخت مایوس ہوئے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے علیحدہ ہونے کا انھیں شدید احساس ہوا۔ ان کا ہندو مسلم اتحاد کا خواب بکھر گیا۔ وفات کے بعد علی گڑھ کالج کی مسجد کے گوشے میں دفن ہوئے۔ سرسید نے بڑی بڑی تصانیف کے علاوہ مختلف رسائل، مقالات اور خطبات سیکڑوں کی تعداد میں لکھے۔ سرسید کے مقالات کا مجموعہ مجلس ترقی ادب لاہور نے شایع کیا۔ [4]

جنگ آزادی ہوئی تو سرسید نے مختصر رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انگریزوں کے طرز حکمرانی پر تنقید کی۔ 1857ء کے واقعات نے ان کے فکر و ذہن پر اثر ڈالا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو دور کر کے دم لیں گے۔ اپنے اس مقصد کا آغاز 1859ء میں مرادآباد میں سکول قائم

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

کر کے کیا۔ سائنس کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے 1864ء میں غازی پور میں ایک سوسائٹی قائم کی۔ یہ سوسائٹی بعد میں علی گڑھ منتقل ہوئی اور اس کا نام سائنٹیفک سوسائٹی رکھا۔ اس سوسائٹی کا شایع ہونے والا جریدہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کہلاتا تھا۔ انھوں نے ہندستان کے مسائل کو پارلیمنٹ میں لانے کے لیے 1866ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ 1869ء میں مغربی تعلیم کے لیے لندن روانہ ہوگئے۔ 1876ء میں ریٹائر ہو کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ 1877ء میں ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی جو 1920ء میں یونی ورسٹی بن گیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اور تعلیمی حالات معلوم کرنے کے لیے 1884ء میں پنجاب کا دورہ کیا۔ اسی زمانے میں ہی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی۔[5]

ان کا سلسلہ نسب 26 واسطوں سے حضور ﷺ تک پہنچ جاتا ہے۔ خطبات احمدیہ میں ان کے سلسلہ نسب کے آخری امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو تقوی سید کہتے ہیں۔ ان کے آبا اجداد نے بنو امیہ اور بنو عباس کے مظالم کے باعث نقل مکانی کی اور ایران کے شہر دامغان میں مقیم ہوگئے۔ اس کے بعد ہرات آئے اور پھر شاہ جہان کے زمانے میں دہلی آگئے۔ اکبر شاہ ثانی (1806ء-1837ء) کے عہد تک ان کا تعلق سلسلہ عالیہ کے ساتھ رہا۔ سید محمد دوست کا تعلق سر سید کے اجداد کے ساتھ تھا اور سید محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے شانہ بشانہ تھے۔[6]

سید محمد دوست واپس ہرات لوٹ گے لیکن ان کے صاحبزادے سید برہان دہلی میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ سر سید کے دادا سید ہادی اسی محمد برہان کے پوتے تھے۔ سر سید کے والد میر متقی بھی دربار سے وابستہ تھے۔ اس طرح انھیں ورثے میں ہی حکمرانوں سے رغبت اور ربط و تعلق ملا تھا۔ انھوں نے اس تعلق سے انگریزی عہد میں بھی فائدہ اٹھایا۔ سر سید نے تیراکی اور تیر اندازی بھی اپنے والد سے ہی سیکھی تھی۔[7]

سر سید نے اپنی جوانی زندہ دلی کے ساتھ رنگین صحبتوں میں گزاری۔ راگ رنگ کی محفلوں، دعوتوں، جلسوں اور درگاہ پر میلے ٹھیلوں میں شرکت کرتے۔ بسنت کے میلوں میں طوائفوں کی گائیکی سے لطف اٹھاتے تھے۔ اپنی غفلت شعار زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے، جو صوفی تھے تو رومی سے بر تر تھے۔"[8]

سر سید کے تین کام نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک مسلمانوں کی تہذیبی علامت اردو کے لیے ان کی غیرت تھی۔ دوسرا مسلمانوں کی سیاسی حوالے سے رہنمائی کرنا جس میں کانگرس سے دوری اور مستقبل میں دونوں قوموں کے جدا جدا راستوں کا تعین کرنا۔ تیسرا کام عصری تقاضوں کی روشنی میں مذہبی اعتقاد کی تعبیر نو کرنا۔ سر سید نے اس اصول پر کام کا آغاز کیا کہ فطرت بھی خدا کی علامت ہے، یہ بھی اسی کی تخلیق کردہ ہے اور قرآن مجید بھی آیت اللہ ہے۔ اگر یہ دونوں ایک ہی خدا کی آیات ہیں تو پھر ان میں تضاد کا جواز نہیں بنتا۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیات کی تعبیر و تشریح فطرت کے اصولوں کے عین مطابق کرنی چاہیے۔ سر سید کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوئی فلسفی یا دانش ور فطرت کو آیہ الٰہی تسلیم کر کے اس کے تصورات کی تعبیرات و توجیہات کرتا ہے تو وہ اس کی اپنی ہوں گی۔ لہٰذا ان کا یکساں ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس میں ہر فلسفی اور سائنس دان کا اپنا اپنا عہد، علاقائی رویہ اور ثقافتی تعصبات بھی اثر انداز ہوں گے۔ سر سید نے فطرت اور قرآن مجید دونوں کو آیت اللہ قرار دیا اور کہا کہ دونوں ایک ہی خدا کی نشانیاں ہیں تو ان میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔[9]

اقبال نے اپنے خطبات میں سر سید کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے چھٹے خطبے اجتہاد میں متعدد فضلا کا تذکرہ آیا ہے۔ اس سے دو باتیں مقصود ہو سکتی ہیں۔ ایک اقبال سر سید کے اجتہادات کی اختلافی بحث سے گریز کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ برصغیر میں ایک تنازعہ کا باعث بنی رہی۔ اس لیے اقبال نے سر سید کی تحسین و تنقید نہیں کی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ سر سید کو محض تعلیمی اور سیاسی مصلح سمجھتے تھے۔ عجب بات یہ ہے کہ یونانی اہل علم و فن سے تطبیق ہمارے معتزلہ کی قدیم روش رہی ہے اور سر سید کے جدید فلسفہ سے بیزاری کا اظہار کرنے کے باوجود موجود ہے۔ اقبال دیباچہ میں اس کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "میں نے کوشش کی ہے کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات اور مختلف انسانی علوم میں جدید ترین تحقیقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام کے مذہبی فکر کی تشکیل نو کروں تاکہ میں جزوی طور پر ہی سہی، اس مطالبے کو پورا کر سکوں۔ اس طرح کے کام کے لیے موجودہ وقت نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ کلاسیکی فزکس نے اب اپنی ہی بنیادوں پر تنقید شروع کر دی ہے۔ اس تنقید کے نتیجے میں اس قسم کی مادیت جسے ابتدا میں اس نے ضروری سمجھا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

تھا، تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔ اب وہ دن دور نہیں جب مذہب اور سائنس اپنے درمیان ایسی ہم آہنگیوں کو ڈھونڈ لیں گے جن کا ابھی تک وہم و گمان نہیں۔"[10]

اقبال کے متذکرہ اقتباس سے معتزلہ، اشعریہ اور سرسید کی تطبیق کا احساس ہوتا ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں مرزا غالب کا تو تذکرہ کیا ہے لیکن سرسید کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ غلام احمد پرویز نے اپنی کتاب میں اقبال سے آخری ہونے والی ملاقات میں لکھا ہے کہ اقبال نے کہا: "جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں، جی چاہتا ہے کہ کہیں سید احمد شہید بریلوی اور سید احمد خان دہلوی کی روحوں کو بھی اکٹھا کروں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں ہیں، میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقع پر ان کو لکھوں گا۔"[11]

تاہم اقبال نے ارمغان حجاز میں بھی اپنی اس آرزو کی تکمیل نہیں کی۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کو انگریز کے سایہ عافیت میں لانے کی سعی کی۔ رسالہ طعام اہل کتاب، ان کے مقالات، تفسیر اور اجتہادات اور تعلیمی اداروں کے پس پردہ یہی جذبات موجزن تھے۔ رسالہ طعام اہل کتاب 1866ء میں تحریر ہوا اس رسالے میں سرسید نے "مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے میں کوئی احرام چیز نہ ہو۔ کھانا پینا درست" قرار دیا۔ پھر انھوں نے اسے آیات قرآنی اور حدیث سے ثابت بھی کر دیا۔ اس مقالے کی اشاعت 14 ستمبر 1886ء میں سوسائٹی کے رسالے میں ہوئی۔[12] سرسید کا تصنیفی کام بہت زیادہ ہے۔ سرسید کی نیت نیک تھی لیکن ان کی یہ نیت محض سیاسی اور علمی کاموں تک محدود تھی۔ فلسفہ ان کا میدان نہیں تھا۔ اس لیے فلسفہ فطریئت کو اپنا کر اس کا مذہب پر بے دریغ استعمال کرنا نئے فتنوں کا سبب بنا۔ اس سے سرسید کی شخصیت بہت متنازع بن گئی۔ جب سید جمال الدین افغانی نے ردنیچر ایک رسالہ تحریر کیا اور مولانا شبلی نعمانی سرسید کی تحریک سے جدا ہو گئے تو جدت پسند سرسید کو شدید ندامت اٹھانا پڑی۔[13]

سرسید کی زندگی کا دوسرا دور سن 1838ء تا 1857ء تک کا ہے۔ 1838ء میں ان کی والدہ کی وفات ہو گئی تو ان کا وظیفہ کم ہو گیا۔ وظیفہ کم ہونے کی بنا پر ان کی آمدن محدود ہو گئی۔ چنانچہ ملازمت ان کی ضرورت بن گئی۔ ان کی زندگی کا اصلی دوران کی تصنیف و تالیف سے شروع ہوتا ہے۔ سرسید نے سن 1835ء میں تین مختصر رسالے طبع کرائے۔ ان رسالوں میں ایک حضور اکرمؐ کی ولادت باسعادت اور رحلت پر تھا۔ سن 1842ء میں حکیم احسن خان کی سفارش پر بادشاہ نے سر کا خطاب عطا کیا۔[14]

اقبال نے اپنے تمام نظام فکر میں سرسید کو بیگانہ رکھا۔ بال جبریل، زبور عجم، ضرب کلیم اور اسرار و رموز میں کہیں بھی ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بانگ درا میں "سید کی لوح تربت" نظم میں اقبال نے ان کی دینی بصیرت اور سیاسی بلوغت کا بالکل بھی اقرار نہیں کیا۔[15]

12 مئی 1935ء کو سر راس مسعود کے نام ایک خط میں اقبال نے ایک پراجیکٹ راس مسعود کے وسیلے سے نواب بھوپال کو پہنچایا۔ "میری خواہش ہے کہ اعلی حضرت خود مجھے اپنی ریاست سے پنشن منظور کر دیں تاکہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک بے نظیر کتاب ہو گی اور ان کے نام اور شہرت کو بقائے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لیے ایک بڑی خدمت ہو گی اور میں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں، جب یہ کہتا ہوں کہ آج دنیائے اسلام میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کے لیے تیار ہو سکتا ہوں کہ اس کتاب کو اعلی حضرت کی نذر کر دوں اور اس پر کسی طرح کا کوئی حق نہ رکھوں۔ یہ ایک قابلِ غور تجویز ہے، مہربانی کر کے مجھے لکھیے کہ کیا آپ اس تجویز کو اعلی حضرت کے سامنے رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کا ایسا خیال نہ ہو تو مہربانی کر کے اسے ان کے سامنے نہ لکھیے اور یہ لکھیے کہ اعلی حضرت کی اسکیم کی حقیقت کیا ہے۔"[16]

اقبال نے اپنے قرآن پر منصوبے کا تذکرہ سر راس مسعود کے نام متعدد خطوط میں کیا ہے۔ اس خط کے ایک دن بعد یعنی 13 مئی 1935ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "مجھے یہ احساس ہے کہ میں زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں اور میری دلی تمنا ہے کہ میں قرآن کے بارے میں اپنے افکار کو اس دنیا سے جانے سے پہلے قلم بند کر دوں۔ جو تھوڑی سی توانائی مجھ میں باقی ہے اسے اب اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم سب تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا۔"[17] اقبال کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور وہ یہ خدمت انجام نہ دے سکے۔ اس ناکامی کا سبب ان کی اہلیہ کا انتقال اور ان کی صحت کا بہتر نہ ہونا ہے۔ نواب بھوبال نے ان کی پانچ سو روپے پنشن مقرر کر دی تھی۔ اس کا ذکر یکم جون 1935ء کو سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں موجود ہے۔ اقبال نے 29 جون 1936ء کو سر راس مسعود کے نام ایک خط میں ایک خواب کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خواب اقبال نے 3 اپریل کو دیکھا تھا۔ اقبال لکھتے ہیں: "3 اپریل کی شب کو

جب میں بھوپال میں تھا، میں نے تمھارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آکر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے، اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے۔ الحمد للہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہر حال اس کا نام ہو گا "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق "ضرب کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہو گی۔"[18] مثنوی پس چہ باید کرد میں "در حضور رسالت مآبؐ" کے عنوان سے اقبال نے اس خواب کا ذکر یوں کیا ہے: "شب 3 اپریل 1936ء کہ در دار الاقبال بھوپال بودم سید احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ یوں رادر خواب دیدم فرمودند کہ از علالت خویش در حضور رسالت مآبؐ عرض کن۔"[19] شاعری میں اس خواب کے علاوہ سر سید کا کہیں بھی ذکر موجود نہیں۔

سید نذیر نیازی کی مرتبہ کتاب میں سر سید کا ذکر متعدد بار آرہاہے۔ یہ کتاب اقبال کی صحبت کی بیاض یادداشت ہے۔ اس میں جنوری 1938ء تا 21 مارچ 1938ء تک کی یادداشتیں موجود ہیں۔ اقبال نے انگریزی عہد میں اعتدال پسند مسلم قیادت کی کمی کا تذکرہ کیا تو سید نذیر نیازی نے سر سید کا ذکر کیا جس پر اقبال نے کہا: "سر سید کی ذات بڑی بلند تھی، بڑی ہمہ گیر، افسوس ہے کہ مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔" پھر اقبال نے ذرا وقفے کے بعد کہا: "علی گڑھ کی عمارت آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونوں پر تیار ہوئی تھی۔ اس سے مسلمانوں کا ذہنی احیا مقصود تھا نہ ان کے شعور ملی کی تقویت۔ مقصد تھا تو یہ کہ مسلمان مغربی علوم و فنون حاصل کریں اور مغربی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوں۔ یہ مقصد پورا ہوا۔۔۔ غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے۔ حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں۔ علی گڑھ کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ اسلام میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے۔ یہ قوت علی گڑھ میں بھی کار فرما تھی، لہذا باوجود مغربی تعلیم کے مسلمانوں کا جذبہ ملی قائم اور بر قرار رہا۔"[20]

سید سلمان ندوی سر سید کی جدت پسندی کو مولانا شبلی نعمانی کی ناراضی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ سر سید نے عقائد کی نہایت مضحکہ خیز تعبیریں کیں۔ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں: " سر سید کا بڑا کارنامہ خرق عادت کا انکار ہے اور اس کے لیے دور از کار تاویلوں پر سارا زور ہے۔"[21] سر سید کے کارناموں کے سلسلے میں رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں: "1864ء میں وہ (سر سید) علی گڑھ آئے اور ان کے ساتھ سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہو کر آگئی۔ 1861ء میں انھوں نے ایک انگریزی سکول غازی پور میں قائم کیا اور مختلف مقامات میں انگریزی تعلیم کے فوائد اور برکتوں پر لیکچر دیے۔ 1866ء میں انھوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن تھا اور نیز اپنی سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک ماہوار رسالہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے نکالا جس میں وہ خود مختلف قسم کے مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔۔۔ ولایت میں ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور 1870ء میں ہندستان واپس آئے۔ یہاں آکر انھوں نے معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے مطالعہ سے مسلمانان ہند کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔"[22]

سر سید نے ایک نہایت کامیاب زندگی بسر کی۔ اعلیٰ مناصب اور اعلیٰ مقاصد کی خاطر ہر طرح کے خطرات کو برداشت کیا۔ ان کی زندگی کی خصلت محنت اور ریاضت تھی۔ بے شمار تصنیفی کام بھی سر انجام دیا۔ ڈہر ایونی ورسٹی نے ان کی بحیثیت مصنف ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری سے نوازا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام بڑے تلخ گزرے۔ ان کی آخری ایام کی زندگی کے بارے میں پروفیسر سلیم اختر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے: "سچ یہ ہے کہ ماہ جولائی 1895ء کالج کے حق میں، سر سید کے حق میں اور خود اس خدا ناترس کے حق میں، جس نے مسلمانوں کا کوڑی کوڑی مانگا ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپیہ شراب خوری اور عیاشی میں برباد کر دیا، سخت منحوس اور نامبارک مہینہ تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر رک گئی اور آگے چندے کی راہ مسدود ہو گئی۔ سر سید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا۔"[23]

ان کے لیے دوسرا صدمہ ان کے صاجزادے محمود سے تعلقات میں ناگواری تھی۔ یہ رنج اندر ہی اندر ان کا کام تمام کرتا گیا۔ وفات سے ڈیڑھ دو ماہ قبل انھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بہت کم بولتے اور ہاں اور نہ کے علاوہ سوالات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔[24] 24 مارچ کو انھیں احتباس بول کا عارضہ ہو گیا۔ 26 اور 27 مارچ کو انھیں سر درد سے ہذیان ہوا۔ اس حالت میں سر سید محمود کی کوٹھی سے حاجی اسمعیل کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے جہاں انھیں شدید بخار ہو گیا۔ 27 مارچ 1898ء کو انتقال کر گئے۔ علی گڑھ کے تمام لوگوں، اساتذہ، طلبہ، اہل علاقہ اور مزدوروں نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ ان کو گارڈ آف آنر بھی دیا گیا۔ مغرب سے قبل مدرستہ العلوم کی مسجد کے شمالی پہلو میں مدفون کیا گیا۔ ان کے انتقال پر برصغیر کے ساتھ انگلستان بھی غم میں شریک ہوا۔

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے اور شیخ محمد اقبال کے نام سے شناخت رکھتے تھے۔ انھوں نے سر سید کے انتقال پر مندرجہ ذیل قرآنی آیت سے تاریخ وفات نکالی جو ابھی تک ان کے لوح مزار پر موجود ہے۔

إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ۔[25]

سر سید احمد خاں کا ذکر "بانگ درا" میں (52ص) ایک بار اور "ارمغان حجاز" میں بھی (666ص) ایک بار آیا ہے۔

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگارِ کمالات احمدؑ و محمودؑ[26]

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر — اے کہ تیری رُوح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ — شہر جو اُجڑا ہوا تھا، اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی — صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تُربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدّعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں — ترکِ دنیا قوم کو اپنی سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں — چُھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے — دیکھ! کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے
محفلِ نَو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ — رنگ پر جو اب نہ آئیں اُن فسانوں کو نہ چھیڑ
تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا — ہے دلیری دست اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے — نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم وریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم — شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو — ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے — خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے[27]

یہ نظم جنوری 1903ء کے ""مخزن" میں شایع ہوئی تھی۔ اصل نظم کے تیس اشعار تھے لیکن نظر ثانی میں صرف چودہ اشعار باقی رہ گئے۔ مخزن نے اس نظم کو شایع کرتے وقت مندرجہ ذیل تمہیدی نوٹ لکھا تھا۔

"تخیل کے کانوں نے سر سید مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پر درد سنی، جس کی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا، توقع ہو سکتی تھی۔ خوبی یہ ہے کہ سر سید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا۔ اسی طرح اس کی لوح تربت سے وہ کلمات نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسا نے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں اور جن سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس زمانے میں جب دہلی میں محمڈن کانفرنس کے جلسے زور و شور سے ہو رہے ہیں۔ ان کا شایع ہونا ایک لطف مزید رکھتا ہے۔"[28]

حوالہ جات

[1]۔ اردو جامع انسائیکلوپیڈیا (جلد اول)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، اشاعت اول 1987ء، ص809
[2]۔ ایضاً
[3]۔ ایضاً

4۔ ایضاً

5۔ عروج، عبدالرؤف (مرتب) رجال اقبال، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، طبع اول، مارچ 1988ء، ص46۔47

6۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، 1986ء، ص30

7۔ دائرہ معارف اقبال، جلد دوم، شعبہ اقبالیات پنجاب یونی ورسٹی، اوری اینٹل کالج لاہور، جنوری 2006ء، ص498

8۔ حیات جاوید، ص 57

9۔ دائرہ معارف اقبال، جلد دوم، ص498۔499

10۔ تجدید فکریات اسلام، ص 12

11۔ احمد پرویز، غلام، اقبال اور قرآن، آخری ملاقات 10 جنوری 1938ء، ص98۔99

12۔ حیات جاوید، ص142

13۔ دائرہ معارف اقبال، جلد دوم، ص499-500

14۔ حیات جاوید، ص60۔72

15۔ کلیات اقبال (اردو)، ص52-53

16۔ برنی، مظفر حسین، سید، کلیات مکاتیب اقبال جلد چہارم، اردو اکادمی، دہلی، 1998ء، ص117

17۔ ایضاً، ص118

18۔ ایضاً ص344

19۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (فارسی)، ص844

20۔ محمد اقبال، علامہ، اقبال کے حضور، مرتبہ سید نذیر نیازی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، 2000ء، ص23-26

21۔ حیات شبلی، ص360

22۔ سکسینہ، بابو رام، تاریخ ادب اردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2004ء، ص361-362

23۔ سلیم اختر، پروفیسر، حیات جاوید، حالی کی تلخیص، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1993ء، ص93

24۔ حیات جاوید، ص93

25۔ محمد عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1977ء، ص221

26۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) ص 666

27۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو) ص52-53

28۔ مہر، غلام رسول، مولانا، مطالب بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، 1976ء، ص53